کیا جنگ سے جدال کی ضرورت ہے

اداریہ اخلاقی جنگ پہلا شمارہ

نومبر ۸۸ء سے مارچ ۹۰ء تک کا عہد پاکستان کی تاریخ میں کشمکش اور اضطراب کے حوالے سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔صورت حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے قوم واضح طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، مگر دوسرا گروہ کبھی سرحد میں، کبھی جھنگ میں، کبھی کراچی میں، کبھی لاہور میں، ہارس اینڈ کیٹل شو کے مسئلے پر تقسیم در تقسیم کا شکار ہو کر بھی ایک رہنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس وقت پاکستانی سیاست اضطراری کیفیت کا شکار ہے اور صحافت کی سیمابی طبیعت نے اس معاشرے کو مسلسل ہلچل سے آشنا رکھا جس کی بدولت پاکستان کے شہری سوتے سوتے چونک اٹھتے ہیں اور چونکتے چونکتے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ان حالات میں کچھ ذمہ داریاں ایک انسان، ایک شہری کے حوالے سے مجھ پر عائد ہوتی ہیں۔ جب اپنے چاروں طرف معاشی آزادی، سیاسی آزادی اور صحافتی آزادی کے مطالبات سنتا ہوں تو تحیر کی چادر مجھے لپیٹ لیتی ہے۔آزادی آزادی کی گردان کرنے والے اب اس آزادی کی آڑ میں اور کتنوں کی گردنیں لہولہو دیکھنا چاہتے ہیں۔کیا معاشرے میں اب بھی جنگ و جدال اور قتل و قتال کی ضرورت باقی ہے؟ کیا شہروں کو کھنڈر اور انسانوں کو تاراج کرنے کے باوجود اہل صحافت کی تسکین نہیں ہوئی ہے؟ آج ہم قرطاس و قلم کے ہاتھوں کچلے ہوئے شہریوں کو اظہار کا دریچہ عطا کرنے کی جدوجہد کا دیا روشن کر رہے ہیں۔ میں جب اردگرد آلودہ سیاسی، صحافتی، معاشی اور مذہبی ماحول دیکھتا ہوں تو پھر ایک مخلص اور ایماندار انسان کی حیثیت سے میرا یہ حق ہو جاتا ہے کہ میں اپنی آواز ان آوازوں میں شامل کر دوں جو بہت مدھم ہیں مگر اس منجمد ماحول کو پگھلانا چاہتی ہیں۔میرے سامنے پھولوں کے گجرے نہیں، المناک چہرے ہیں، موتیوں کی مالائیں ہی نہیں، آنسوؤں کے تار بھی ہیں، ریشمی لبادے نہیں، چیتھڑے بھی ہیں، بلند وقار خواتین نہیں، زخم رسیدہ عصمتیں بھی ہیں، دعائے سحر گاہی نہیں، نالہ ہائے نیم شبی بھی ہے۔ ہمالہ صفت محلات نہیں، فغاں بہ لب جھونپڑے بھی ہیں۔ میں دن رات معاشرے کے ہر ہر موڑ پر ایک تماشہ دیکھتا ہوں۔ میرے کان وزنی جیبوں کے قہقہے سنتے سنتے پک گئے ہیں اور میرا دل تہی کیسوں کی فریاد سنتے سنتے ناسور بن گیا ہے۔

آخر ایک حساس آدمی کے لیے کیا لازم ہے کہ وہ ساحل پر کھڑا ہو کر خونی موجوں کا تماشہ دیکھے یا موجوں میں اتر کر ان سے لڑے، طوفانوں سے کھیلے، اپنا گریباں تار تار کر لے اور اس کے پرزوں سے آزادی، انسانیت، شرافت اور محبت کے پرچم لہرائے۔ یہ ننھا سا پرچم، مٹی کا دیا ایک کوشش ہے۔اس کوشش میں آپ کی دعائیں اور آپ کا تعاون دراصل آپ کے اپنے وطن کے لیے ہے جو سب کا ہے اور اگر یہ ہے تو ہم بھی ہیں۔

ساحل جولائی ۲۰۰۶ء

تیز ہوا اور تنہا پھول

اداریہ اخلاقی جنگ دوسرا شمارہ

ہوا تیز ہے اور اتنی کہ کوئی پھول شاخوں پر ٹھہرنے نہیں پاتا، ہوا کی تندی و تیزی ہر پھول پتی بلکہ شاخ شجر اور شاخ ثمر کو بھی اڑا لے گئی ہے اس تیز تر ہوائے زمانہ کے باوجود اخلاقی جنگ کا وجود غنیمت ہے، جب چاروں طرف برگد ہوں تو کسی پودے کی نمو، آبیاری، نشو ونما ممکن ہی نہیں محال ہو جاتی ہے، سورج کی روشنی میں کس کا چراغ جل سکتا ہے اور جہاں آندھیاں تن آور درختوں کو اڑائے جا رہی ہوں وہاں ایک ننھی کونپل، ننھا سا دیا ہوا کے دوش پر کیسے اور کب تک روشن رہ سکتا ہے۔ جس جنگل میں بھیڑیے ہی بھیڑیے ہوں وہاں انسانوں کا رہ جانا، بچ جانا کچھ کر جانا ہی معجزہ ہے اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ معجزے دکھا کر اپنی جلالت اور اپنی عظمت کے نقوش تابندہ رکھتا ہے۔

ہفتہ روزہ اخلاقی جنگ کا پہلا شمارہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا معاصر عزیز تکبیر نے آڑے ہاتھوں لیا ہے، ان کا کرم ہے نوازش ہے کہ پہلا تیر ہی ان کے سینے میں ترازو ہو گیا اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والے اور خاطر جمع رکھنے والے غبار خاطر نکال رہے ہیں۔ پاکستان میں سیاسی ہفت روزہ کا آغاز چٹان نے کیا لیل ونہار نے اسے توانائی اور تازگی دی ہفت روزہ زندگی الفتح اور معیار نے اسے اڑان بخشی اور تکبیر نے اس روایت کو کشتوں کے پشتے لگا کر جاری وساری رکھا اس ویرانے میں ایک نئی عمدہ معتدل اور دلاویز آواز ہفت روزہ ندا کی ہے جس کی سنجیدگی اور وقار ہماری صحافت کے لیے روشن مثال ہے مگر ندا کی غیر جانبداری کو کبھی کبھار اس وقت ٹھیس پہنچ جاتی ہے، جب وہ ڈاکٹر اسرار احمد کے ترجمان کی حیثیت اختیار کرنے لگتا ہے مگر یہ لمحہ آتے ہی وہ غچہ دے کر نکل جاتا ہے ہفت روزہ اخلاقی جنگ دائیں اور بائیں سرخ اور سبز کی اصطلاحوں سے ماوریٰ ہے اس کا سفر صراط مستقیم کا سفر ہے۔ وہ نہ کسی کا شارح ہے اور نہ کسی کا ترجمان وہ صرف عقل کا حالات کا ماضی کی تاریخ کا اور قصہ پائے پارینہ کا ترجمان ہے وہ صرف تاریخ کے گرد آلود صفحات کو الٹ کر انھیں صاف کر کے دوبارہ طباعت کا رخ دینے کا مجرم ہے، اس کا سفر گہرے پانیوں کا سفر ہے، تاریخ کی خاموش وادیوں کا سفر ہے ان دریچوں، دروازوں، گنبدوں اور مسجدوں کا سفر ہے جنھیں کسی نے نہیں دیکھا، دیکھا تو آنکھیں بند کر لیں اور چپ چاپ گزر گئے کہ ان راستوں کا تذکرہ ان قافلوں کی گفتگو سے ان کے مفادات پر ضرب پڑتی تھی اور ان کے افکار وخیالات ومفادات کے لشکر میں تلاطم پیدا ہو جاتا تھا۔

ساحل جولائی ۲۰۰۶ء

ہم پر الزام رکھنے والے اپنے اوپر نظر ڈالیں اس دور سے اس دور تک انھوں نے کتنے رنگ بدلے کتنے چولے اتارے اور کتنے جوڑے زیب تن کیے ان کا سفر کبھی دریائے آمو سے شروع ہوا، کبھی صحرائے گوبی میں ختم ہوا، کبھی قطب نمائے جنوبی پہنچ کر وہ منجمد ہوگئے اور کبھی آبنائے ہرمز سے گزر کر نہر سوئز میں داخل ہوگئے، آج وہ ہمیں الزام دیتے ہیں کہ ہم ان کے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس کے ہیں ان کی مثال اردو شاعری کے محبوب کی ہے جو کسی کا نہیں ہوتا ہرجائی اور کج ادائی جس کا شیوۂ زندگی ہے اور جو کسی کا نہیں ہوتا وہ اپنا بھی نہیں ہوتا خواہ وہ موذن ہو یا امام ہوا یسوں کی تکبیریں رائگاں جاتی ہیں، ہوا پھر تیز چل رہی ہے اور درخت پھر اتنے زور سے ہل رہے ہیں کہ سر لپیٹ کر شاخوں میں سونے والے پرندے گھبرا کر جاگ اٹھے ہیں اور ماحول پر ہیبت طاری ہے مگر اس تیز ہوا میں یہ تنہا پھول مسکراتا رہے گا۔

یہ نعمتیں اور یہ رویہ

اخلاقی جنگ چوتھا شمارہ

پاکستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا گیارھوں بڑا ملک ہے، رقبہ کے اعتبار سے دنیا میں ہماری پوزیشن ۳۳ویں ہے، اس خطے میں ان گنت دریا اور ندیاں ہیں جب کہ دنیا کے سولہ ممالک میں ایک بھی دریا نہیں، ہمارے ملک کے ساتھ طویل ساحل ہے جب کہ دنیا کے سترہ ممالک محض خشکی پر واقع ہیں، اس خطے میں گندم کپاس، گنا اور چاول پیدا ہوتا ہے جب کہ دنیا کے ۴۵ ملکوں میں یہ اجناس پیدا ہی نہیں ہوتیں، دنیا کے ۷۷ ملکوں میں قدرتی گیس کا وجود نہیں جب کہ ہمارے ملک میں ذخائر ہی ذخائر ہیں، ہم ان ۱۷ ملکوں میں شامل ہیں جو بجلی ایٹمی توانائی سے بھی پیدا کرتے ہیں۔

ان نعمتوں، عنایتوں کے باوجود ہماری سرکشی کا وہی حال ہے، ظلم، جبر، دہشت، درندگی، سفاکی اور ہر لب پر شکوہ کوئی شخص اپنے حال پر مطمئن نہیں، کسی ہونٹ پر کلمہ تشکر نہیں اور کسی آنکھ میں ان نعمتوں کی فراوانی پر خوشی کے آنسو نہیں۔ ہر دست، دست سوال، ہر آنکھ بے نور اور ہر لب شکوہ کناں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم سجدہ شکر سے بے گانہ ہے اور کفران نعمت اس کا روزمرہ ہے۔ اے اہل وطن کبھی غور تو کرو یہ نعمتیں اور............ یہ رویہ۔

گالی وہ دیتا ہے جو جاہل ہو

اداریہ اخلاقی جنگ تیسرا شمارہ

روزنامہ جنگ لاہور پر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریس کے مسلح دہشت گردوں کا حملہ دنیا کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے اور بے مثال ہے، اس حملے کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ حملہ آوروں کی آرزو تھی کہ وزیر اعلیٰ پنجاب اور اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر نواز شریف کے خلاف کسی قسم کی کوئی خبر نہ شائع کی جائے اور لطف کی بات یہ تھی کہ اخبار کے مالکان نے ان کے اس مطالبے کو تسلیم بھی کر لیا تھا مگر اس کے باوجود ایم ایس ایف کے جیالوں کی تسلی و تشفی نہ ہو سکی اور شدت جذبات سے مغلوب ہو کر وہ کچھ کر گزرے جو کچھ ان کے سرپرست گزشتہ چند سال سے اسلام، جمہوریت اور وفاق کے ساتھ کر رہے ہیں۔ جنگ لاہور نے ۱۷ مارچ کو پہلے صفحہ پر اس حملے کے متعلق ایک خبر کی سہ کالمی سرخی لگائی ہے کہ ”گالی وہ دیتا ہے جو جاہل ہوتا ہے“ ہمیں جنگ کی اس سرخی سے مکمل اتفاق ہے جس شخص کے پاس دلائل ختم ہو جائیں عقل جواب دے جائے اعضاء کام کرنا ترک کر دیں اور حواس خمسہ کمزور ہو جائیں، وہ سوائے گالیاں دینے کے اور کیا کر سکتا ہے۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے نواز شریف کے اشارے پر جو کچھ کیا اس پر احتجاج کرنے والے اس پر بھی غور کریں کہ وہ دوسروں کے ساتھ کیا کچھ کر رہے ہیں، اس حملہ کا المناک حصہ یہ ہے کہ صحافیوں اور اخباری کارکنوں نے جب اگلے روز احتجاجی جلوس نکالا تو مسلم لیگ ہاؤس سے ایم ایس ایف کے رہنماؤں نے جلوس پر فائرنگ کی اور ان کے نام بھی مغضوب اخبار نے شائع کر دیے ہیں۔ ہم اس ساری صورت حال پر رنج و افسوس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اخبارات میں تشدد اور دباؤ کے ذریعے خبریں شائع کرنے کا رجحان دراصل اخبارات کی غیر متوازن اور جارحانہ پالیسی کے سبب روز افزوں ہے اور تشدد آمیز رویوں سے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے کہ ذرائع ابلاغ معتدل مزاج بن جائیں اور صرف چند اشتہاروں کی خاطر کبھی ایک فریق کو چڑھانے کبھی دوسرے فریق کو گرانے کی غیر اخلاقی حرکتیں ترک کر دیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ۱۹۸۲ء میں جنگ اخبار نے جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم کے خلاف ایک غلط خبر شائع کی تھی جس پر مشتعل ہو کر جمعیت کے جوانوں نے جنگ اور نوائے وقت کے دفاتر کو تہس نہس کر دیا تھا اور اے پی این ایس کی اپیل پر اخبارات کی ایک روزہ ہڑتال بھی ہوئی تھی۔ یہی رویہ ایم کیو ایم نے اختیار کیا اور اب ایم ایس ایف بھی اس راستے پر رواں دواں ہے۔ ہر وہ راستہ جو تشدد کی کوکھ سے جنم لیتا ہے غلط راستہ ہے اور اس راستے کے مسافر ناقابل معافی نہیں ہیں، مگر وہ عناصر جوان غلط راستوں کی رہبری کا فریضہ انجام دیتے ہیں وہ بھی برابر کے مجرم ہیں، اور دونوں کے ساتھ یکساں انصاف ضروری ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستانی صحافیوں اور سیاست دانوں کو فکری، تاریخی، ذہنی، لفظی اور نفسیاتی جبر سے گریز کر کے توازن و اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ دلیل کا جواب دلیل سے اور طاقت کا جواب طاقت سے دیا جانا چاہیے۔ مگر دلیل کے مقابلے میں بندوق کی گولی ایک لمحے کے لیے فضا کو سوگوار تو کر سکتی ہے مگر یہی گولی چلانے والوں کی شہرت کے سینے میں بھی پیوست ہو جاتی ہے۔

ساحل جولائی ۲۰۰۶ء